

ایک ماہ پہلے معاذ کا دوست یہاں سے ہو کر گیا تھا۔ سبز پہاڑوں کے برف پوش پہاڑوں میں ڈھلنے کے قصے اس نے ایسے اور اتنے مزے لے لے کر سنا لیے کہ معاذ سے رہانہ گیا۔ لاہور سے خالہ زاد شامل اور عرفان کو ماموں زاد جرار عمرا اور محل کو اور پنڈی سے مدیحہ کو جو اس کی سب سے چھوٹی خالہ کی پندرہ سالہ بیٹی تھی اپنے ساتھ لایا۔

”سوچو یا! کتنے پاگل نہیں ہم میں چھ بیس سال کا ہونے والا ہوں اور اب یہاں آ رہا ہوں۔“

”لیکن میں صرف اٹھارہ سال کا ہوں۔ میں آپ سے کم پاگل ہوں۔“ جرار نے دانت نکالے۔ جب سے وہ مری آیا تھا یا اس کے دانت نکل رہے تھے یا نکل رہے تھے۔

”تمہیں لایا کون ہے یہاں؟ تمہارے ابا نے تو پورے دو گھنٹے کا لکچر دیا تھا کہ جنوری میں مت جاؤ۔“

”پا لوگوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ چھوٹے انہیں میرا بتائیں۔ کیا میں نے کچھ کہا؟“

”تم نے کیوں اف کرنا تھا؟ جیب تو میری خالی ہو رہی ہے۔“

”تو اکیلے آ جاتے۔ یہ احسان و احسان مت جتانیں پلیز! اٹھارہ سال کے بچے کی جیب میں کتنے پیسے ہوں گے بھلا؟“

”اٹھارہ سال کے بچے کی جیب میں اتنی فون ہو سکتا ہے؟ خرچ کرنے کے لیے پیسے نہیں۔“

”میں فری میں نہیں آئی رہائش میری طرف سے ہے۔“ مدیحہ نے پست نکال کر چھلکا جرار کی طرف پھینکا۔

”وہ مدیحہ! کیا گپ ماری ہے؟ ماحول کو گرما دیا ہے۔ شامل اور عرفان! ذرا کھڑکیاں تو کھول دو۔“

”کیوں؟ کیوں؟“ مدیحہ چڑھ گئی۔

”پہلے تمہارے بابا کو کبھی تمہید کے بعد میں نے یہ بات یاد دلانی کہ ان کے بھائی اور تمہارے چچا کا ایک عدد گھر ہے تو مری میں جسے تمہارے چچا ریسٹ ہاؤس کہتے پھرے تھے ایک لمبی ”ہوں“ کے بعد جس میں

باگوری شامل تھی، تمہارے بابا کو یہ ریسٹ ہاؤس یاد آیا اور تمہارے چچا جو عشاء کے بعد موبائل آف کر دیتے ہیں، بمشکل تمام ان کے گھر کے چار افراد سے رابطہ کر کے ان کا موبائل آن کروایا۔“

”تو آپ ان چاروں میں سے کسی ایک کو کہتے تاکہ چچا جان سے بات کروا دیں۔“ جرار مدیحہ کے چچا سے متعلق گفتگو ہمیشہ بہت اچھوائے کرتا تھا۔

”ان چاروں میں سے کوئی بھی اپنا موبائل اپنے بابا کو ضرور“ بھی دینے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ معاذ نے ایک آنکھ دبا کر جرار کو وضاحت دی۔

”مل ٹو گیا نا فری میں ریسٹ ہاؤس۔“ مدیحہ اتر کر بولی۔

”ہاں مل گیا، ایک لمبی ہدایات، ضروریات، احتیاطات، امکانات، تمکانات“ جرار نے رک کر سانس لیا۔ ”اور فضولیات کی لسٹ سننے کے بعد۔“

مدیحہ کے علاوہ سب دل کھول کر ہنسے۔ جرار بلا وجہ دیر تک ہنستا رہا۔



ریسٹ ہاؤس قدرے نشیب میں تھا۔ پہلے ایک ڈھلان تلی سڑک پھر چار بڑی اور کھلی میڑھیاں پھر پکا پکا راستہ پھر چھ عدد میڑھیاں پھر پکا پکا راستہ اور کنارے پر مزید دس قدم میڑھیاں اتر کر تین کمروں کا یہ نیلی چھت والا ریسٹ ہاؤس گلوپر سڑک سے تو ریسٹ ہاؤس نظر بھی نہیں آتا تھا۔ گاڑی پارک کر کے اپنا سامان باہر نکال کر سب سے پہلے جرار نے سڑک سے گھر کی طرف جانے والے راستے پر موجود برف پر اپنا پہلا قدم رکھا جسے چاند رینل نے رکھا ہو گا۔ یہ ان سب کا پہلا مشترکہ ٹور تھا کسی بھی پہاڑی اور برفانی علاقے میں۔

آس پاس بکھری برف کو ان سب نے بے یقینی سے دیکھا۔

”پنڈو۔“ نمل زیر لب بڑبڑاتی۔ کون سا راستہ اور

کبھی میڑھیاں، ریسٹ ہاؤس تک کا سارا راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ گرتے پڑتے معاذ اندر سے جبار کو بلا کر لایا جو اپنے ساتھ کدال اور ایک پتلا ڈنڈا لیتا آیا۔ کدال سے اس نے میڑھیوں کو میڑھیوں کی شکل دینے کی کوشش کی۔ برف بری طرح جم چکی تھی۔ بمشکل دو قدم کی ایک لمبی لائن وہ سڑک سے گھر تک بنا سکا۔

لوکے گرتے پڑتے سامان شقت کرنے لگے۔ لڑکیاں لاٹک شوز اور لاٹک کوٹ سنہا لتی جبار کا سہارا لیے باری باری گھر تک جانے لگیں اور جاتے جاتے تین چار بار مزے سے پھسلیں۔

”ظلموں میں تو ہیروئن مزے سے ڈانس کرتی رہتی ہے برف پر، ہم کیوں بار بار پھسل رہے ہیں۔“ نمل نے ٹکر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ پاکستان کی برف ہے شاید اس لیے اور وہ یورپ کی ہوتی ہے۔“ خزانے ہمیشہ کی طرح زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دیا۔

”ایک تو ہر اچھی چیز یورپ میں ہی ہے۔“ نمل قدم جما کر چل رہی تھی۔

ہر بار ان کے پھسل جانے پر جبار مضحکہ خیز انداز سے ہنسنے لگتا۔ وہ گھر کا کل وقتی ملازم تھا۔ رات کو اس کے خزانے من کر شامل اور نمل یہ سمجھے کہ شیر باہر کھڑا دھاڑ رہا ہے اس کی ہنسی اور خزانے ایک جیسا ہی رد ہم رکھتے تھے۔ برف پر ایسے چلتا تھا جیسے بندر کی طرح چھلانگیں لگا رہا ہو۔ معاذ کے نزدیک وہ ایک برفانی بدردھ تھی جو خاص برفانی علاقوں میں ہی پائی جاسکتی ہے۔

”بنا ہی نہیں چلا ایک ہفتہ گزر گیا۔“ عرفان کم بولتا اور سب سے زیادہ مزے کرتا تھا۔ ہفتہ گزر جانے کا وہ کہہ رہا تھا کہ آٹھ روز اور شامل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آٹھ دن ان میں ہی گھس کے بیٹھ جائیں۔

”گراچی کے رہائشی تو باباؤں کے ہی ہو جاتے ہیں یہاں اگر۔“ مدیحہ نے معاذ سے انبا دلہ لیا۔

”پنڈی کے رہائشیوں کو یہ موقع بھی نہیں ملتا۔

پندرہ سال ہو گئے تھیں پنڈی میں رہتے اور برف کے گولے بنانا کرایے اچھا رہی تھیں جیسے ہر سیزن یہاں آتی ہو۔“ معاذ بھی چپ نہیں رہا۔

”پنڈی کھینے والے بچے کھونٹے پھرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔“ وہ اواسے بولی۔

”یہاں تم ہی ایس ایس کی تیاری کرنے آئی ہونا اس بار؟“

”واپسی کب ہے؟“ خزانے کے سوال پر عرفان نے اسے کچھ زیادہ ہی غصے سے گھور کر دیکھا۔

”خبردار جو کسی نے واپسی کا نام لیا۔“ معاذ نے انگلی اٹھا کر سب کی طرف باقاعدہ لہرا کر کہا تاکہ سب دیکھ لیں اچھی طرح۔

”گھروں سے فون آئے تو کو آواز نہیں آ رہی۔ زیادہ آئے تو فون بند کر دو۔ بند فون بھی بچنے لگے تو فون اٹھا کر باہر پھینک دو۔ یہاں میں تمہیں کھلا رہا ہوں گھوما رہا ہوں، وہ سب خود تو کبھی تمہیں یہاں لائے نہیں۔ اب بچے خود آ گئے ہیں تو برداشت نہیں ہو رہا۔“

”پھر بھی کب تک؟“ شامل جو کافی دیر سے موبل پہلی نکال نکال کر جج کر رہا تھا ایک ساتھ ہی ساری منہ میں ڈال کر پھسکی پھسکی آواز میں بولا۔

”کسی کو کوئی براہم ہے یہاں رہنے میں؟ نہیں نا؟ آرام سے رہو بھیج اٹھو باہر نکلو، برف پر پھسلو، گولے بناؤ، شیر باغی اونٹ بناؤ، آکس کیٹنڈی کھاؤ، اوھر اوھر گم ہو جاؤ اور رات کو اس پیارے سے آتش دان کے پاس آکر بیٹھ جاؤ اور گیس لگاؤ بعد میں دیکھیں گے کب جانا ہے واپس۔ میں نے تو موبائل آف کر دیا ہے دو دن سے۔“

”خلل سے آپ کا مطلب گرل فرنڈ تو نہیں؟“ جرار نے بنیدگی سے پوچھا۔ معاذ نے صرف گھورنے پر اکتفا کیا۔

”لگتا ہے کہ وہ قاف میں آ گئے ہیں۔“

”کوہ قاف میں برف ہوتی ہے۔“ خزا کا سائنسی

سوال۔ ”نہیں۔ جن اور پریاں ہوتی ہیں۔“ مثال گفتگو میں شریک ہوا۔

”پیارے صرف چند دنوں کے لیے اجازت دی تھی۔“ حرا پھر پریشان ہو گئی۔

”پیارے کا فون آئے تو کہہ دینا۔ برف کا تو وہ کرنے کی وجہ سے راستے بند ہیں۔ ہم رستہ ہاؤس میں قید ہیں۔ راستے کھلتے ہی آجائیں گے۔“ معاذ نے مکمل سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

”میں پیارے جھوٹ نہیں بولتی۔“

”جو جو جھوٹ نہیں بولتا وہ اپنا سامان تیار کر لے۔ صبح گھر والوں سے جا کر بیچ بول دینا۔ انتظام کروں گا تم سب کے جانے کا۔“ معاذ نے چڑ کر کہا۔

”میل برف کے توڑے کرتے ہیں؟“ مدیحہ پریشان ہو گئی۔

”برف ہے تو یقیناً کرتے ہی ہوں گے۔ جبار سے پوچھ لیتے ہیں۔“ معاذ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”رہنے دیں پلیز اس طرح ہنستا ہے جیسے ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔“

”وہ مذاق نہیں اڑاتا اصل اودھس ہر بات کو انجوائے کرتا ہے۔“ معاذ نے جبار کا دفاع کیا۔

”یہ جو چھت پر اتنی ساری برف گری ہے اگر چھت گر گئی تو؟“ میرا دوست بتا رہا تھا کہ اس کی ٹانی کے گھرا بیٹ آباد ہر سال کسی نہ کسی کی چھت گر جاتی ہے برف کی وجہ سے۔ جبار نے آنکھیں گھما گھما کر بتایا۔

”چھت! معاذ سوچتے لگا۔ گھر تو دو منزلہ ہے اگر چھت گری تو اوپر والی منزل کی گرے گی۔“ معاذ نے سب کو تسلی دی۔ ”لور ہر موقع پر تمہارے اور تمہارے دوست کے پاس کوئی نہ کوئی بری کہانی ہی ہوتی ہے سنانے کے لیے اتنے سارے دوست ہیں کہ ہر جگہ کسی نہ کسی کی ٹانی ڈاؤی موجود ہے کہانیاں سنانے کے لیے۔“



رات کا کھانا کھانے سے پہلے وہ سب باہر کا ایک اور چکر لگا آئے تھے۔ نیو مری، شیمپو، پوائنٹ مال روڈ پر ایک بار جا کر بار بار جارہے تھے۔ سب کچھ ان کے لیے نیا تھا اور وہ سب بھرپور انجوائے کر رہے تھے۔ وہ ہر بار نئی سے نئی چیز دریافت کر لیتے۔ برف سے ڈھکے چھوٹے بڑے گھر دھند میں لپٹے پیاز اور درختوں اور برف سے ڈھکے ہوائی گھر۔ پٹی گول سڑکیں، کبھی نیچے تو کبھی اوپر ایک دم سیدھی اور اچانک سے تنگ اور پتلی۔

اس دن وہ سب دریائے نیلم گئے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا اور رات کا کھانا کھانے سرشام ہی مین مال پر آگئے۔ جبار اور معاذ کا مشترکہ خیال تھا کہ مال روڈ سے بہتر جگہ تفریح کے لیے کوئی اور نہیں۔

”اسلام علیکم لالا جی!“ جبار نے دور سے ہی ہاتھ سر تک لے جا کر پکارت لگائی۔

”بورے پاگل لگتے ہو۔“ مدیحہ کو اس کی یہ حرکت بری لگتی تھی۔

”اسلام کرنا گل بن ہے؟“ وہ حیران ہوا۔

”مسخرے لگتے ہو پورے دیکھو اودھ خان صاحب بھی ہنس رہے ہیں۔“

”ہاں تو! میں آیا ہی دنیا میں دوسروں کو خوش کرنے کے لیے ہوں۔“

موسم آبر آلود تھا ایسا لگ رہا تھا ہر چیز دھواں چھوڑ رہی ہے ایک ایک دودھ کروں پر مشتمل ہونٹوں کے باہر کاؤنٹرز پر پکتے کھانوں میں خاص کر سٹیک، کبابوں اور جی کی خوشبوئیں بہت دلفریب محسوس ہو رہی تھیں۔

آبر آلود گہری شام کی دھند لاتی روشنیاں اور بے فکر لوگوں کی بے فکر چل قدمی اس شام کا حسن تھی۔

معاذ نے سب کو بڑی بڑی آنکس کینڈی لے کر دی۔

”واو! کینڈی کھاتے کھاتے ہر دو منٹ بعد معاذ کے منہ سے ٹکٹا مال پر چلتے چلتے لوگوں کا رش اتنا تک بڑھ گیا ہونٹوں کے انجٹ ہر نئے آنے والے کے پیچھے بھاگتے ہاتھ پکڑ کر اس طرف کھینچے بھی۔

”جبار! ابا تو کہہ رہے تھے اس موسم میں پاگل ہی لگتے ہیں۔“ معاذ نے حرا اور مدیحہ کو مخاطب کیا۔ ”یہ ہزاروں پاگل ہیں کیا؟“

”یہ ہزاروں لوگ نہیں ان کے ابا۔“ مثال نے اپنا فرض سمجھا اس بات کا جواب دینا۔

”مثبت ابا! مدیحہ سے پہلے حرا چلائی۔

زیادہ تر لوگ لڑکیوں کے گروپس تھے۔ اس موسم میں بوڑھے تو بیکار لگتے۔ کپڑوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ زیادہ تر کا تعلق مری، پٹنڈی، اسلام آباد اور قریب کے ہی دوسرے علاقوں سے تھا۔ ایلیٹ کلاس زیادہ نظر آ رہی تھی۔ لڑکوں کا ایک گروپ ان ٹراپوں کو دوہاں آنے والوں کو سامان، بچوں یا ضعیف افراد کو کرائے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں غلط استعمال کر رہے تھے۔ ایک بیٹھا ایک ٹھٹھا پچھلے آگے کھنٹے سے وہ مال پر ہی تماشہ کر رہے تھے۔ ساتھ بے ہودہ ہو ہو ہاں۔

”الگ سے چلنے پھرنے والے بری طرح بے زار تھے ان کے اس بے ڈھنگے شوق سے۔“

مال سے زیر زمین مارکیٹ کی ایک دکان سے چلی کباب اور دوسری دکان سے کڑائی کھا کر وہ شاپنگ کے ارادے سے اودھ اور دھند کاٹوں کا جائزہ لینے لگے۔

معاذ پہلے ہی کہہ چکا تھا جو فارغ ہوتا جائے گاڑی کے پاس آتا جائے گاڑی وہاں سے کافی دور پارک تھی۔ معاذ جہاں تک سمولت سے ڈرائیونگ کر سکتا تھا وہاں تک کر کے گاڑی پارک کر دیتا تھا۔ ان گول گول بل کھاتی سڑکوں پر وہ گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔

حرا ایک دکان میں کافی دیر سے کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کتنا لے یا جو لری۔ وہ چاہتی تھی اپنی دوست کے لیے ایک جیسی ہی چیزیں لے لے۔ باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ مال پر افرا تفری ہی شروع ہو گئی تھی۔ حرا نے سر ہار نکال کر دیکھا۔ پتلی برف باری انہوں نے رستہ ہاؤس میں دیکھی تھی اور دل کھول کر مڑا کیا تھا اس نے جلدی سے اپنا بیگ چیک

کیا اس کے پاس پیسے کم تھے کچھ دیر پہلے مکمل اس کے ساتھ ہی اس دکان پر مختلف چیزیں چیک کر رہی تھی۔ اب وہ غائب تھی۔ باہر نکل کر اس نے ایک دو دکانوں میں جھانک کر مدیحہ کو دیکھا مگر نہ وہاں مدیحہ تھی نہ ہی کوئی اور۔ گروپ کی صورت تو انہوں نے پہلے بھی بھی شاپنگ نہیں کی تھی۔ کوئی کیس ہوتا کوئی کہیں۔

”بیٹا! آپ مال کے ہی کسی ہوٹل میں رہائش پذیر ہو؟“ وہ کرتوں والی دکان پر واپس آئی کہ ایک دھوی خرید لے۔ جب کام کرتے بزرگوار بنے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے سر فٹنی میں ہلایا سال پر برف باری کا ہلکا گلا انتہائی پیچ چکا تھا۔

”اسلام آباد سے آئی ہو تو جلدی نکل جاؤ۔ برف باری میں سڑک پر پھسلنے کی وجہ سے روڈ بند ہو جاتے ہیں اور۔“

اسلام آباد کے لیے نفی میں سر ہلاتی اگلی بات سنتے ہی وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ باہر بھی افرا تفری کا ہی عالم تھا۔ اس کا فون بھی بج رہا تھا لیکن تیزی سے قدم جما جا کر چلتے ہوئے وہ بیک میں سے فون نہیں نکال سکتی تھی۔ مال پر گاڑیوں کی لمبی لائن اسے نظر آئی۔ گاڑیوں کے ہارن ٹوکوں کا شور مچانک ہی منظر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ گاڑیوں کے درمیان سے وہ بمشکل آگے بڑھنے لگی۔

”کہاں ہو۔ جلدی آؤ۔“ مسلسل بجتے فون کو اس نے ایک جگہ رک کر سنا۔

”آ رہی ہوں۔“ کہہ کر وہ تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے لگی۔

مال کی مین سڑک اس نے عبور کر لی تھی۔ اب میل کھاتی گول نیو مری کی طرف جانے والی سڑک جس کے ایک طرف بہاؤ تھا درمیان میں چھوٹی سی سڑک اور دوسری طرف کھائیاں اور سڑک کے انتہائی کنارے پر برف بھی وہ چلتی کہاں برف کے اوپر۔ جیسے تیسے کر کے وہ کنارے کنارے چلتے لگی۔ گاڑیوں میں بیٹھے لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے چلتے

والوں میں سے وہ اکیلی ہی لڑی تھی جو جلدی میں بھی تھی جو کھلائی ہوئی تھی اور پریشان تھی۔

”جلدی کو حرا! معاذ کی جو بھی بار کال آئی۔“
”سب آچکے ہیں۔ ایک تم ہی نہیں آئیں کہاں ہو تم؟“ فوجی ہیں یہاں سے جلدی نکلنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ راستہ کلیئر کروا رہے ہیں۔ میں گاڑی آگے لے کر جا رہا ہوں۔ تم ذرا تیز چلو۔“

وہ تیز کہاں سے چلتی دو بار پھسل چکی تھی گاڑیاں آگے پیچھے پھنسی کھڑی تھیں۔ لگتا تھا اب ہر شخص کو جانے کی جلدی ہے۔ ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ رکی ہوئی ٹریفک میں کبھی کبھی برائے نام حرکت پیدا ہو جاتی۔ شاید راستہ آگے سے جام تھا پھر ان میں ٹھوڑی سی زیادہ حرکت نظر آنے لگی اور گاڑیاں آگے پیچھے تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ اب تو وہ سڑک پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ ناچار وہ برف کے ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اور وہ پھر تھوڑا بہت جتنا راستہ مل رہا تھا چلنے لگی۔ عجیب مشکل تھی۔ بیک میں رکھافون بار بار بج رہا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ ضرور اچھ کر پیچھے جا کرے گی۔ گو وہ ایسی خطرناک کھائیاں نہیں کھیں پھر بھی گرنے کا خوف الگ تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا سا ہوا اور وہ خوف سے بری طرح گر پڑی۔ برف کے ڈھیر میں شاید کوئی ٹھوس چیز پڑی ہوئی تھی جو اس کی کمر پر بری طرح لگی۔ اٹھ کر سنبھلنے پر درد کی ایک تیز لہر اس کی کمر میں اٹھی۔ دھماکے کی آواز سے اوسان الگ خطا تھے گاڑیوں میں سے لوگ نکل نکل کر سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”حرا! تم ٹھیک ہو؟“ معاذ کی گھبرائی ہوئی آواز سے فون پر سنائی دی۔ وہ رونے لگی اور وہ گہرا گیا۔ ”وہ گاڑیاں الٹ گئی ہیں۔“

”کیا؟“ وہ درد محسوس کر چلائی۔
”ہاں۔۔۔ تم تو حادثے والی جگہ کے پاس نہیں ہوتا“ کہاں ہو تم۔“

”مجھے نہیں معلوم میں برف پر بیٹھی ہوں۔ میں کبھی گئی۔ کمر میں درد ہے۔ بہت۔ آگے جانے کا راستہ نہیں ہے۔ آپ کہاں ہیں؟“
”لگتا ہے تم اس جگہ سے کافی دور ہو۔ یہاں گاڑیاں الٹی ہیں۔ تم وہیں بیٹھی رہو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ میں نے پانی سب کو رسٹ ہاؤس بھیج دیا ہے۔ میں اکیلا یہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے اسے کافی دیر ہو گئی۔ افراتفری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ریسکیو ٹیم آچکی تھی۔ وہ لوگ مستعدی سے ادھر ادھر مصروف ہو گئے۔ وہ لوگوں کو گاڑیوں میں پر سکون بیٹھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ پیدل اور گاڑیوں دونوں کے لیے آگے جانا ناممکن تھا۔

”میڈم آپ ٹھیک ہیں؟“ ایک فوجی اس کے پاس آیا۔

”نہیں۔“ اس نے روٹی صورت لیے کہا۔ ”میں گر گئی ہوں اور مجھے وہاں جانا ہے۔“ اس نے ہاتھ سے بلاک سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”میری فیملی وہاں ہے اور میں یہاں اکیلی ہوں۔“

فوجی نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا۔ ”وہاں دو گاڑیاں الٹ چکی ہیں۔ جب تک کریں نہیں آئی سڑک کلیئر نہیں ہوگی۔“
”کب آئے گی کریں؟“ اسے لگایا کوئی پندرہ بیس منٹ تک آجائے گی۔

”کل تک شاید یہی سڑک کلیئر ہو۔“
”کل تک۔“ وہ چلائی۔ جلدی سے معاذ کو فون کیا ساری صورتحال بتائی۔ معاذ لانا خود پریشان ہو گیا۔

فوجی لوگوں کو گاڑیوں میں سے نکلنے کا کہہ رہے تھے۔ لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کے بیٹھے تھے۔ پیٹرول ختم ہوتے ہی بیٹر بند ہو جاتے اور ان کی گاڑیاں بنا پیٹرول کے وہیں بند کھڑی رہتیں۔ وہ بار بار انہیں یہی سمجھا رہے تھے گاڑیوں میں لاک رہنے سے ان پر غنودگی طاری ہونے کا خطرہ تھا۔ بیٹر بند ہوتے ہی نیند میں ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خاص کر بچوں

بچوں کے ساتھ۔ لوگ گاڑیاں لاک کر کے مال روڈ کے ہولڈز کی طرف بھاگے۔ حسب معمول مال کے ہولڈز ایسے ہی کسی واقعے کے انتظار میں تھے انہوں نے موقع دیکھتے ہی کرائے پانچ چھ گنا بڑھا دیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے کمرے جن کے کرائے سردیوں میں چار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اب سات، آٹھ ہزار ہو گئے تھے۔ لوکل ویکٹوں اور ٹیکسیوں میں بیٹھے لوگ زیادہ پریشان تھے۔

”بیٹا! آپ ٹھیک ہیں؟“ وہ سروی سے کانپ رہی تھی اور کمر کا درد الگ۔
”نہیں۔“ اس نے صاف کہا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے اور رونے سے آنکھیں سرخ۔
”ادھر آئیں میرے ساتھ۔“ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ایک فوجی جب تک آئی۔

”یہاں بیٹھیے۔“ وہاں تین چار خواتین پہلے سے ہی موجود تھیں اور گرم دودھ پی رہی تھیں۔ ایک کپ حرا کو بھی دیا۔

”آپ کا نام کیا ہے بیٹا؟“
”حرا! اس کی آواز بڑی طرح کانپ رہی تھی۔
”حرا بیٹا! پریشان مت ہو۔ میں ڈاکٹر خاور ہوں۔“

”میری کمر میں درد ہے میں گر گئی تھی۔“
”اوه! ٹھنڈ کی وجہ سے زیادہ درد محسوس ہو رہا ہوگا۔ میں آپ کو پین کھڑ نہیں دے سکتا، جب تک اچھی طرح سے چیک اپ نہ ہو جائے۔ آپ کی فیملی۔“

اس نے سر سے بلاک سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں یہاں اکیلی ہوں۔ اس طرف۔۔۔ یہیں وہ لوگ۔“

وہ سمجھ گئے۔ ”پریشان مت ہو بیٹا! ایک تو بچے آپ لوگ کسی کی بات نہیں سنتے کب سے الارٹ دے رہے تھے کہ اس موسم میں گھروں میں رہیں۔“
”میں لاہور سے آئی ہوں۔“
”بیٹا! رات تک تو یہ راستہ کلیئر نہیں ہوگا۔ آپ

اکیلی ہو۔ ہو۔ ہو! میں بھی نہیں جانتیں۔ میرا گھر یہاں سے کچھ دور ہے۔۔۔ پانچ لوگ میرے ساتھ چارے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔ یہاں مجھے سب جانتے ہیں۔ قریب ہی میرا اسپتال ہے۔ آپ اپنی فیملی سے پوچھ لیں۔“
اس کا تو تصور اب بہت چلتا دلتا بھی ہاؤف ہو چکا تھا اگر معاذ وغیرہ کچھ نہ کر سکے تو وہ کیا کرے گی۔ اس نے معاذ کو فون کیا۔ ساری صورت حال بتائی پھر معاذ کی ڈاکٹر خاور سے بات کروائی۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ان کے ساتھ۔“ معاذ نے پانچ منٹ اسے ہولڈ کروانے کے بعد کہا۔ ”میں نے یہاں کھڑے فوجیوں سے ان کے بارے میں پوچھا ہے۔ سب جانتے ہیں انہیں وہ قاتل اطمینان ہیں۔ تم جاؤ ان کے ساتھ، میرا تمہارے پاس آنا ناممکن ہے۔“
”میں انہیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ ڈاکٹر خاور نے ان پانچ افراد کی طرف اشارہ کر کے ایک فوجی افسر کو بتایا۔

کافی دیر چلتے رہنے کے بعد ڈاکٹر خاور کے گھر پہنچے کھانا کھلا کر ان کی ملازمہ جنت حرا اور ایک دوسری عورت کو ایک کمرے میں لے آئی۔ پانی لوگ ہال میں لگے بستر پر پہلے ہی ڈھیر ہو چکے تھے۔ پینڈ پر گرتے ہی وہ سو گئی۔ اس کی کمر بہت دکھ رہی تھی۔ گرائنڈ ملنے ہی درد کم ہونے لگا۔ اس میں اتنی بہت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر دوش روم تک ہی چلی جاتی۔

☆ ☆ ☆
وہ اتنی گہری نیند سوئی جیسے اپنے بیڈ روم میں ہو۔ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ فریٹش ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی۔ گھر میں بہت سے افراد کی موجودگی کے آثار نظر آرہے تھے وہ کچن میں آگئی۔

گھر بہت بڑا کھلا اور کشادہ تھا، آتش دان بہت بڑا اور قدیم طرز کا تھا۔ لاؤنج کے ایک طرف کچن اور دوسری طرف ہال نما کشادہ کمرہ تھا۔ ہال کے ساتھ ہی آگے پیچھے دو کمرے بنے تھے جن میں سے ایک میں وہ سوئی

تھی۔
”یہ لیں آپ ناشتا کریں۔“ اس کے کچن میں آتے
ہی جنت نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ ”کھائے ہوئے توں،
آلیٹ اور جام تھا۔“

اور سب کو کھلایا بھی۔
 ”بی بی! میں سونے لگی ہوں بہت تھک گئی ہوں۔
 آپ بھی سو جائیں۔“
 ”میں بی بی نہیں ہوں۔ میرا نام حرا ہے۔“ حرا نے
 نرمی سے کہا۔

بے نیچ شاید دھند میں لیٹی کوئی چیز تھی۔ سو وہ علمائے
 آئی کہ وہ جنت ہی ہو۔
 جنت جنت!«
 لیکن جنت نہیں آئی۔ پانچویں کوشش میں وہ پھر
 وحی پا کر نکل آئی۔ اس بار وہ عدد پانچوں اس کے باہر

انداز میں اس کے الفاظ دہرائے اور ایسے ہی کنارے پر آکر بیٹھ گیا جیسے اپنی ہنسی اور حیرت دہرایا ہو۔

”میں نے تمہیں گرایا ہے؟“ میں نے کہا تھا اُس سے اس خراب موسم میں نکلو اور یہاں ٹھونسنے چلی آؤ۔

نیز چیلن الرٹ دے دے کر تھک چکے ہیں لیکن

جوڑے تھے کو گڑھے میں نیچے سے اوپر کی طرف آڑھا
رہا۔ اس پر سے چل کر اوپر آجائے۔
وہ اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ جائے تو وہ
اوپر آئے اس کے سامنے وہ باہر نہیں آتا چاہتی تھی
مگر وہ مزے سے وہیں کھڑا رہا چار ہاتھوں اور پیروں کی
مدد سے بلی کی طرح چلتی وہ باہر آئی۔
”یہ تختہ میں بیٹیں رہنے دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے
تمہارا دوبارہ اس طرف آنے کا ارادہ ہو۔“
وہ اس کے آگے آگے چلتا ہوا مسلسل بول رہا تھا۔
حرا کا دل چاہ رہا تھا اسے اس گڑھے میں دھکا دے
دے۔ وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی اور چلتے چلتے وہ
دوبارہ گری۔
اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ”بہت خوب۔ کمال کا
گرتی ہو۔ پھر گر کر دکھاؤ۔“ ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ
کھڑا ہو گیا۔
وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کی شکل بتا
رہی تھی کہ وہ بمشکل ضبط کر رہی ہے اور سامنے والے
کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ اس کے ضبط سے خوب
مخلوظ ہو رہا ہے۔
”بہت ذہین ہو۔“ وہ اسے سر سے لے کر نیچے تک
دیکھ کر بولا۔
”بہت اچھی میچنگ کی ہے شوژ کی ڈریس کے
ساتھ لیکن شاید ہمیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ برف پر
چلنے کے لیے شوژ کو اوپر سے نہیں نیچے سے دیکھا جانا
ہے۔ تمہارے شوژ پچھلے کے لیے ہسٹ ہیں۔ ان
فیکٹ ان سے بہتر شوژ دنیا میں اور ہو ہی نہیں سکتے۔
سو کیپ سلینگ۔“
”کہہ کر وہ آگے چلے گا۔“

اس بار وہ زیادہ احتیاط سے قدم جما کر چلنے لگی۔ اس
وقت وہ اپنے سب سے بہترین سوٹ میں ملبوس تھی۔
سادہ ڈیل ہائی ٹیک ٹیمپرے نیلے، ٹاپ نمائی شرٹ اور ہم
رنگ گھٹنوں تک لانگ کوٹ، سیاہ اسکارف گرہ کی
صورت گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا اور جن لانگ شوژ پر
اس نے اتنی تنقید کی تھی۔ وہ لانگ شوژ ایمر جنسی میں

رات ایک بڑے اسٹور سے لائی تھی۔ برفانی علاقے
وزٹ کرنے کے لیے یہ اس کی سن پندرہ تک تھی۔
اس کی قسمت خراب کہ چلتے چلتے وہ ایک بار پھر
پھسل گئی۔
اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا
جیسے سالوں بعد موقع ملا ہو۔
”بہت خوب۔ بہت خوب۔“
غصے اور خفت سے وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے اس
کے سامنے اٹھ کر چلنے کی کوشش ہی ترک کر دی اور
اس کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرنے لگی۔
”کیا انداز ہے تمہاری لوگوں کا۔“ بلند بانگ خود
کلامی کرتے وہ اپنی چلائی گیا۔
ایک بار مزید کرنے کے بعد وہ بھی اندر آئی گئی۔
پکن میں سے اس کے اور جنت کے ہنسنے کی آوازیں
آ رہی تھیں۔ خفت اور شرمندگی سے اس کا برا حال
تھا۔ اتنے لمبے ترنگے انسان کے سامنے اس کی اتنی
بے عزتی ہو گئی تھی۔
کچھ ہی دیر میں جنت اس کے لیے چائے سے بھرا
مک اور دو اسبلے اینڈے لے آئی۔ جنت کی آنکھیں
ابھی بھی مسکرا رہی تھیں۔
”حرا بی بی! اپنا موڈ خراب مت کیجیے۔ مہران بھائی
ایسے ہی ہیں۔ میں بھی گر جاتی تو ایسے ہی کرتے۔
رات بھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام بھی کرواتے رہے
ہیں اور باتیں بھی سناتے رہے ہیں سب کو۔ لوگوں کا جو
گروپ رات یہاں رہا ان کے ساتھ تو انہوں نے حد
ہی کر دی۔ کہہ رہے تھے کہ اس خراب موسم میں اگر
وہ گھر سے نہ نکلتے تو اتنے شاندار حادثے کا شکار کیسے
ہوتے۔“

جنت کافی دیر تک بولتی رہی لیکن اس نے نہیں
سنا۔ اسے شدید غصہ تھا۔
”بد تمیز۔ جاہل!“ حرا غصے سے بڑبڑاتی۔ جب وہ
جنت کے ساتھ مل کر گھر صاف کر رہی تھی تب تک
کوئی گھر میں موجود نہیں تھا۔ شاید یہ بہر ان ٹائی بلا کچھ
دیر پہلے ہی گھر آئی تھی۔

”کوئی دوا ہے تو مجھے۔ میں اپنے ہاتھوں پر
لگاؤں۔“ حرا نے دونوں ہاتھ جنت کے سامنے کر کے
کہا۔
”اوہ!“ وہ ہاتھوں کو دیکھ کر رہ گئی۔



وہ جنت کے ساتھ کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہی
پھر جنت پکن میں چلی گئی۔ محل سے فون پر بات کرنے
کے بعد وہ بھی پکن میں آئی۔ اسے دھڑکاہی لگا ہوا تھا
کہ وہ پھر نہ آجائے۔ اس شخص کے سامنے اس کی
عجیب و غریب درگت بنی تھی۔
جتنا ہو سکا وہ جنت کے ساتھ کام کرواتی رہی۔ رات
جو خواتین آتی تھیں۔ انہیں جنت کھانا اور دوا دے
چکی تھی۔ ان میں سے ایک کو نمونیا ہو چکا تھا۔ ایک
وہی بہت بیمار ہو گئی تھی۔ بار بار تے کر رہی تھی۔
بمشکل سات بجے تھے۔ کام کروا کر وہ واپس کمرے
میں آئی۔ ایک دو میگزین رکھے تھے اٹھا کر پڑھنے لگی،
پڑھنا کیا تھا عجیب سے میگزین تھے نہ فیشن سے متعلق
نہ شو بزنس۔ بیڈ کی سائیڈ پر پین رکھا تھا، اٹھا کر وہ اپنا
پسندیدہ کام کرنے لگی۔ وہ اپنے ہاتھ کتنے والے ہر
اخبار، میگزین، تصویر، کتاب پر ناک، کلن، مونچھیں،
واڈھی، ٹوٹی گول وائمنڈ والی بڑی عینک بنا دیا
کرتی تھی۔ میگزین میں موجود ڈاکٹر کو چارلی کی طرح لبا
ٹیل والا کوٹ اور ٹوکوں کو سینڈرٹلا فرائک پسند آیا کرتی
تھی۔ بنائے گئے کرداروں کے نام اور ان سے متعلق
جیلے بھی لکھا کرتی تھی۔ کافی دیر تک وہ میگزین کے
ساتھ مصروف رہی۔
”ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ کو برانہ لگے تو
کھانا ان کے ساتھ کھالیں۔“
”میں آ رہی ہوں۔“



سلام کر کے وہ ڈائننگ ٹیبل پر ان کے ساتھ بیٹھ
گئی۔ باہر برف پاری ہو رہی تھی آتش و دن روشن تھا۔
مڑبلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گرم اور روشن ماحول

”بہت اچھا لگ رہا تھا۔“
”فیل کیسی ہے حرا آپ کی؟“ چاولوں کی ٹرے اس
کے سامنے کر کے وہ پوچھنے لگی۔
”وہ سب ٹھیک ہیں۔“ حرا ان کے بارے میں
بتانے لگی۔

”حادثے والی جگہ تو کلیئر ہو چکی ہے لیکن برف
باری کی وجہ سے اس طرف سفر خطرناک ہو سکتا ہے
خاص کر نیو مری کی طرف۔ صبح تک کوشش کر کے میں
آپ کو بھجوا دوں گا مگر آپ یہاں اطمینان سے رہیں۔
میری وائف سریدیاں شروع ہوتے ہی اسلام آباد یٹی
کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ زیادہ ٹھنڈ پسند نہیں کرتی۔
ہم چار لوگ ہی یہاں ہوتے ہیں اس موسم میں۔ آپ
کو یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں۔“
”نہیں۔“ اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔
”میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ جو کچھ آپ نے
میرے لیے کیا۔“

شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں بننا ایہ میرا فرض
تھا۔ جنت نے مجھے بتایا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ مہران بس
ایسا ہی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ
ہماری مہمان ہو۔“

”بس اس کے۔“ ڈاکٹر صاحب شرمندہ شرمندہ سے
اسے اچھے نہیں لگے۔

”مذاق کرنا ہے بس وہ۔ سنجیدہ نہیں ہوتا۔“ وہ
اس کا دفاع کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ صبح تو
اس نے یہاں سے چلے ہی جانا ہے پھر کیوں نہ وہ مسٹر
مہران صاحب کا حساب برابر کرتی جائے۔

”آپ اتنے شفیق ہیں اور ان کا رویہ۔ برتاؤ۔“
وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔ ادھوری بات زیادہ پراثر
ہوتی ہے۔

کھانا کھاتے یکدم ان کے ہاتھ رک گئے۔

”تی بد تمیزی سے وہ میرا مذاق اڑاتے رہے۔ بلند
بانگ قہقہے لگاتے رہے۔ گھر آئے بے بس مہمان کے
ساتھ کوئی ایسا کرنا ہے۔“ وہ بھول گئی تھی کہ وہ گھر آیا
مہمان نہیں۔ گھر لائی ٹی پناہ گزین ہے۔

”جائے۔ گناہ پاگل۔“ زیر لب وہ تین گالیاں دے کر وہ کمرے میں آگئی۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر اسے ڈاکٹر صاحب مل گئے۔ اس بار اس نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی غلطی نہیں کی۔ معاذ نے ان سے بات کی۔ ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے۔

”بیٹا! آپ پریشان نہ ہو۔“ وہ حرا سے مخاطب تھے۔ ”آپ انگلیٹن سے رہو۔ راستہ کلیئر ہو متب جانا۔ ہم آپ کی مہمان نوازی بار نہیں۔“ جنت کے ساتھ مل کر پھر حرا نے جتنا ہو سکا تھا کام کروایا۔ ایک بار بار جانے کے بعد دوبارہ باہر نہیں گئی۔

”حرا بی بی سبزیاں کٹ دیں گی آپ؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ حرا آلو پھیلنے لگی۔“ ڈاکٹر صاحب نے چھ لوگوں کا کھانا منگوایا ہے۔ ایک ڈبرہ کھنے میں اکبر آجائے گا کھانا لینے۔ روٹی کے لیے آنا کم ہے۔ سوچا، جتنی دیر میں میں آٹالاؤں گی آپ سبزیاں بنا کر پکا دیں گی لیکن میری واپسی تک تو آپ آٹو می سبزی بھی نہیں بنا سکیں گی! آپ بازار تک جا سکتی ہیں؟“

”ہاں! کیوں نہیں۔ کہاں ہے بازار۔؟“

”سیدھے ہاتھ والی سڑک سیدھی جاتی ہے کچھ دور ہی دکانیں ہیں وہاں سے مل جائے گا۔“

جنت جلدی جلدی اسے باقی ضروری چیزیں بھی بتانے لگی۔

”اپنے شوز دے دو مجھے۔“ حرا نے جنت کے شوز پہن لیے۔ سڑک پر بہت پھسلن تھی لیکن وہ آرام سے چل رہی تھی۔ جوتوں کا فرق اسے معلوم ہو گیا تھا۔ تیزی سے چلنے کے بعد اسے آٹو سے کھٹے بعد دکانیں نظر آئیں۔

”یہ کچھ دور ہے؟“ اس نے جنت سے تصدیقیں کہا۔

اس نے سارا سامان لیا واپس جاتے ہوئے کے لیے چلنا مشکل ہو گیا۔ آتے ہوئے ڈھلان پر اب چڑھائی تھی۔ وہ بھی سامان کے ساتھ تین دنوں کا شاپر زائٹا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ کچھ چلنے کے بعد سامان سڑک پر ہی چھوڑ کر وہ واپس دکان کی طرف گئی۔

”ٹرالی ہے؟“ اس سوال پر دکان دار اس کی دیکھنے لگا۔ ناچار وہ پھر واپس ٹرالی شاپر زائٹا لے کر جنت بھی تو سوا لے کر جاتی ہی تا تو پھر میں کیوں نہیں۔ اس نے ہمت سے کام لیا۔ وہ دس منٹ چلتی شاپر زائٹا رکھتی سانس لیتی پھر اٹھا کر چلنے لگی۔

”ہم شری لوگ۔“ خود ہی کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ سوچتی ہوئی جنت مجھے کچھ آتا ہی نہیں ہے۔

پھولے ہوئے سانس کے ساتھ وہ ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھی، ایک کار تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر رکی، اس کا خیال تھا ڈاکٹر صاحب جنت کا شوہر ہو گا لیکن وہاں مہران صاحب تھے اس نے بیٹھے بیٹھے ہی پیچھے کا دروازہ کھولا، حرا نے جلدی جلدی سامان اندر رکھا اور دروازہ بند کر دیا اور اپنا اسکارف ٹھیک کرتی آگے بڑھ گئی وہ بھی زن سے کار آگے بڑھانے لگا۔

”بد تمیز! ایک بار بھی نہیں کہا کہ بیٹھ جاؤ۔“ غصہ سڑک کر کے اس نے آس پاس غور کیا بہت دلکش سڑک تھی۔ دور دور سے چھوٹے چھوٹے گھر نظر آرہے تھے۔ وہ فرصت سے آرام آرام سے چلنے لگی۔ کبھی کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ دن روشن نہیں تھا۔ دھند میں لیٹا ہوا تھا۔

برف کے ایک ڈھیر کے پاس رک کر وہ برفانی رینگے بنانے کی کوشش کرنے لگی کافی دیر تک ہناتے رہے کے بعد بھی جب برف نے رینگے کی شکل اختیار نہیں کی تو وہ اسے وہاں ہی چھوڑ کر گھر کی طرف آئی۔

لیکن برف نظر پڑتی ہی وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ جنت جلدی جلدی روٹیاں بنا رہی تھی اور مہران انہیں

بیک رہا تھا۔ اسے بے انتہا شرمندگی ہوئی۔ اسے جلدی آنا چاہیہ تھا تاکہ وہ جنت کے ساتھ کام کر سکے، شرمندہ شرمندہ سی وہ کمرے میں آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد جنت آگئی۔

”ٹرالی بی آجائیں۔ میں نے ہال میں دسترخوان لگا دیا ہے۔“

شرمندہ سی وہ آکر ان سب کے ساتھ کھانا کھانے لگی اگر جنت بغیر کسی غرض کے سب کی اتنی خدمت کر سکتی ہے تو وہ کیوں نہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ جنت کے مقابلے میں کس قدر چھوٹی ہے۔

جنت کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے سب کچھ سمیٹا، برتن دھوئے اور پچن صاف کیا۔

شام ہونے سے پہلے ہی تینوں عورتیں اور مرد چلے گئے۔ شام کو وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکل لیکن پھر کمرے میں واپس آکر الف ایف ہنسنے لگی۔ جنت کمرے میں آئی اور کمرے میں رکھے میگزین اٹھا کر لے گئی۔ دس منٹ بعد ہی وہ انہیں لیے واپس آئی۔

”ٹرالی بی! یہ سب آپ نے کیا ہے؟“ جنت نے دو تین صفحے اس کے سامنے الٹ پلٹ کر پوچھا۔ وہ جواب کیا دیتی۔ اس کی شکل پر جنتی شرمندگی بتا رہی تھی کہ یہ سب اس نے ہی کیا ہے۔ جنت میگزین واپس لے گئی۔ پانچ منٹ بعد دروازے پر دستک دے کر مہران آکھڑا ہوا۔ غصے سے اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔

”یہ آرٹ کے نمونے آپ نے بنائے ہیں؟“ حرا نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ گھر اس کا نہیں اور نہ ہی وہ میگزین اس کے تھے نہ ہی یہاں مل سکی جو برداشت کر سکتی۔

وہ شرمندہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے سوال پر سواری کے کیا ”ہاں“

”اس میگزین کو غور سے دیکھئے! ایسی ایسا میگزین دیکھا ہے۔ یہ کوئی فلمی یا فیشن میگزین نہیں ہے۔ اس میگزین کو میرا دادا وہ محدود تعداد میں شائع کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جن کا اس شعبے سے تعلق ہے یعنی

میرا۔ اور ان کو پڑھنے والے کسی ناور چیز کی طرح انہیں سنبھال کر رکھتے ہیں۔ انہیں آپ سنبھال کر رکھئے۔ آپ کی آرٹ کی نمائش کے لیے کام آئیں گے۔“

اس نے میگزین بیڈ پر پھینکے اور چلا گیا۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا یہ اس گھر میں کی جانے والی اس کی باقاعدہ غلطی تھی۔ وہ حقیقتاً ”پناسر“ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ڈرتے ڈرتے وہ کمرے سے باہر نکلی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں جنت! میری غلطی ہے۔“ مہران کے سامنے تو وہ ایک لفظ نہیں کہہ سکی۔

”جو ہونا تھا ہو گیا، خرابی بی! اب آپ پریشان نہ ہوں۔“ ”میں واقعی بہت شرمندہ ہوں، ہم میری طرف سے ان سے معذرت کر لو۔“

”میں کہہ دوں گی۔“ جنت مسکرائی۔ سارا وقت وہ کمرے میں رہ رہ کر اپنی حرکت پر کڑھتی رہی۔

رات گئے ہمت کر کے کمرے سے باہر آئی تاکہ جنت کے ساتھ جا کر خود سے مہران سے سواری کہہ آئے۔ لاؤنڈ میں روشن دان کے پاس ہی وہ کتاب لیے بیٹھا تھا، قریب ہی لیپ ٹاپ پر انگلش میوزک بج رہا تھا۔

اس نے اسے دیکھ نہ لیا ہوتا تو وہ واپس چلی جاتی بھاڑ میں جائے سواری، کل تو اس نے واپس چلے ہی جانا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”میں میگزین کے لیے آپ کو سواری کہنے آئی ہوں۔“

”مب کیا ہو سکتا ہے ٹیوٹ۔“ اس نے کوئی تاثر دے بغیر کہا یعنی غصہ ابھی بھی تھا۔

”میں جانتی ہوں، میری غلطی ہے۔“ اس نے اتنا ہی کہا۔

”آپ ہماری مہمان ہیں مب آپ کو کچھ کہہ تو نہیں سکتے۔ اس لیے اس اوکے۔“ وہ پھر بتا تاثر کے

بولے۔

اس کا بارہ یکدم ہائی ہو گیا۔ معذرت تو بندہ طریقے سے قبول کر لے۔
”میں آپ کی نہیں ڈاکٹر صاحب کی مہمان ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے پناہ دی، میری مدد کی، میرا خیال رکھا۔ آپ تو جب ملے، خوشخوار منہ بھاڑی ملے ہیں نہ لڑکی ہونے کا احساس ہوا نہ ہی اکیلے اور مہمان ہونے کا خیال۔“

”ہوں۔۔۔“ اس نے ایک لمبی ہوں کی۔ جیسے مزے لے کر اپنا پسندیدہ کھانا کھایا جاتا ہے۔ ”خوشخوار۔۔۔ منہ بھانٹ۔۔۔ بہت اچھی باتیں کر سکتی ہیں آپ۔۔۔ بہت متاثر کیا اس بار بھی آپ نے۔۔۔“
”آپ کی بد تمیزی نے بھی بہت متاثر کیا مجھے۔ وہ بد بولی۔“

”اس بد تمیز شخص نے ہی اس رات آپ کو اکیلا دیکھ کر اپنے پاپا کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اس گڑھے میں آپ خود گریں، لیکن نکالا میں نے۔ چائے میری آپ نے گرا دی، تم میرا تو دبا جو میری بہن خاص میرے لیے ملائی تھیں۔ لائی تھی۔ میگزین میرے آپ نے آرٹ کے نمونے بنا دیے اور بد تمیز بھی میں ہوں۔۔۔ آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”اگر میں آپ کے گھر میں نہ ہوں تو میں آپ کو بتاتی کہ آپ کیا ہیں۔ اور میں کیا ہوں۔“ وہ غصے سے بھڑک اٹھی تھی۔

”آپ میرے گھر میں ہیں اس بات کو بھول جائیں۔ آپ بتائیے مجھے۔“
”میں آپ سے سو رہی کر رہی ہوں اور آپ باتیں سنارے ہیں مجھے۔“

”مجھے نہیں چاہیے آپ کا سو رہی۔۔۔ پھر۔۔۔“
”پھر یہ کہ آپ بھاڑ میں جائیں۔“
”جہاں آپ گری تھیں وہاں؟“ وہ تسخر سے بولا۔
”جہاں اس کے چہرے پر آئی مسکراہٹ کو دیکھا۔ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، کچھ کہے بنا وہ کمرے میں واپس آ گئی۔

”آپ وہیں جا رہی ہیں؟“ اسے اپنے پیچھے آواہن دے کر دیکھا۔
”جنگلی۔۔۔ جنگلی۔۔۔ گنوار۔۔۔“ وہ دیر تک برسرِ حال رہی۔

صبح ہوئے ہی معاذ کا فون آ گیا وہ اسے لینے آ رہا تھا۔
”ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے ناشتا کر کے جنت سے پوچھا۔
”وہ تو رات آئے ہی نہیں۔“

اس کے بیگ میں مال سے خریدی ہوئی کچھ چیزیں تھیں۔ اس نے بے حد شکریہ کے ساتھ وہ جنت کو دی، جو بھدا اصرار بھی وہ نہیں لے رہی تھی اس کے شوہر اکبر کے ساتھ اسے مال تک جانا تھا وہیں سے معاذ نے اسے لینا تھا۔

جنت سے اچھی طرح مل کر وہ اکبر کے ساتھ اپنی راستے میں آنے والے ڈاکٹر خاور کے چھوٹے سے ہسپتال میں ان سے مل کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے مال سے معاذ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ریسٹ ہاؤس آ گئی۔

وہ سب لوگ تیاری کر کے بیٹھے تھے۔ اس کے آتے ہی فوراً واپسی کے لیے نکل پڑے۔ اس کی کہانی سننے کے بعد جس میں مہمان کا کہیں ذکر نہیں تھا، سب اپنی اپنی خوش گپیوں میں مگن ہو گئے۔ سب معاذ کو دھمکی دے رہے تھے کہ وہ سب جا کر حرا کے پچھڑ جانے والی کہانی سب کو سنائیں گے۔

”میرے پاپا کی توجہ جو اتنے بڑے گینگ کے ساتھ اس طرف آیا۔“
”مسئلہ گینگ نہیں تھا مسئلہ موسم تھا ہم نے فلا وقت کا انتخاب کیا۔“ شامل نے گینگ کا دفاع کیا۔

”یار! برف ہی نہیں دیکھ پاتے تو کیا فائدہ یہاں آنے کا۔“
”آپ شہری لوگ برف دیکھنے کے لیے تو کیا ہو جاتے ہیں۔“ مگنی دیر سے خاموش حرا یکدم بولی۔

”ہم شہری لوگ مطلب۔۔۔؟“ شامل حیرت سے بولا۔
”ہاں! ہو جاتے ہیں پاگل۔ جو نہیں دیکھا اس کے لیے ہوتے ہیں ناشتا اسل ہوا اور دھوپ پر ہی گزارا کرتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں ہم شہری لوگ۔“
معاذ کو بات بات پر بلاوجہ غصہ آ رہا تھا شاید وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔
”آپ یہاں شغف ہو جائیں معاذ بھائی! مدد۔“

”بھیدگی سے سوچ رہا ہوں۔۔۔“
”خاں سب سے زیادہ خاموش تھی۔ آتے ہوئے جو جوش ان سب میں تھا جاتے ہوئے وہ اداسی میں بدل گیا تھا اور یہ اداسی سب سے زیادہ حرا محسوس کر رہی تھی۔ وہ ہرگز رتی سڑک، درخت، پہاڑ، گھر کو اداسی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ واپسی پر وہ اتنی اداس ہو جائے گی۔ لیکن وہ اداس اور خاموش ہوئی ہی جا رہی تھی۔

مئل نے کالج میں سب کو مزے لے لے کر اپنے نور کے بارے میں بتایا حرا کسی کو کچھ نہیں سناسکی۔
وہ تین بن بھائی تھے۔ بڑی ممل، حرا اور پھر جراس۔

ان کے پاپا اتنے سخت تھے کہ ان کی بڑھائی کی وجہ سے گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی انہیں نہیں جانے نہیں دیتے تھے معاذ کراچی سے آیا تو وہ اسے انکار نہیں کر گئے۔ ویسے بھی معاذ ان کے کرن کا بیٹا تھا۔ وہ اسے پسند بھی کرتے تھے اور اعتبار بھی۔ معاذ کا پروگرام سن کر جراس نے اتنا شور ڈالا کہ انہیں تینوں کو اجازت دینی پڑی۔

مئل انجینئرنگ تھوڑا بڑی اسٹوڈنٹ تھی اور حرا کام کی سربراہ کنزرس۔ گرمیاں آئیں۔ اور پھر گرمیاں بھی گزر گئیں۔ حرا کی اداسی بڑھتے بڑھتے مسلسل خاموشی کی صورت اختیار کر گئی۔ شروع میں

سب نے ٹوٹ کیا پھر وہ اس کی خاموشی کے عادی ہو گئے۔ میوزک کو سنتے سنتے اس نے گانوں کے بولوں پر توجہ دینی شروع کر دی اور وہ انہیں دہراتی رہتی۔ حیرت انگیز طور پر اس نے ایک بار عابدہ پروین کو سنا اور وہ سنی ہی جا رہی تھی۔
”معاذ سے شادی کر دی؟“ مئل نے اچانک دھماکا کیا تھا۔

”حرا کو جیسے کرنٹ لگا۔“ تم نے کیوں پوچھا؟“
”پاپا اور ماما کی خواہش ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا معاذ کے ساتھ رشتہ بکا ہو جائے۔ سوچا تم سے تمہاری مرضی پوچھ لوں۔“
”نہاں۔۔۔ اس نے فوراً کہا۔“ اور تم؟“
”ظاہر ہے نہاں۔۔۔“ مئل دل کھول کر نہیں۔ ”معاذ کی بھی یہی مرضی ہے۔ تمہیں تو میں ویسے ہی تنگ کر رہی تھی۔ ویسے تم نے معاذ کے لیے نہ کیوں کہا۔ کوئی خرابی ہے اس میں؟“

”نہاں۔۔۔“
”اتنا کہہ کر وہ ایسے خاموش ہو گئی جیسے پھر نہیں بولے گی۔ اس کی نظریں چھوٹے سے سفید پیر پر پڑ گئیں۔ جب وہ اکبر کے ساتھ ڈاکٹر خاور کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو واپسی پر اس کی نظر سڑک کے کنارے اس پر پانی ریچھ پر پڑی تھی جو وہ بنانے کی کوشش کرتی رہی تھی، لیکن بنا نہیں سکی تھی وہ برف کا ریچھ خوبصورتی سے تیار کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں برف ہی سے بنا سفید ک تھا جو وہ منہ کے قریب لے کر جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ کس نے بنایا ہو گا۔ اس وقت اس نے اسے غصے سے دیکھا تھا لیکن اب وہ اسے بری طرح یاد آ رہا تھا۔

ہمارا کام موسم تھا اور وہ سرخ سمیوں کا تازہ جوس نکال رہا تھا۔
”مگنی مرچ دو جنت!“ اس نے قریب ہی کام کرتی جنت سے کہا۔

”وہ وہ تو کل ہی ختم ہو گئی تھی یا وہی نہیں رہا منگوانا۔“

”تم کسی کام کی نہیں ہو جنت! مہران پچھلے ڈیڑھ سال سے اسے دفنے دفنے سے یہ ضرور کہہ دیتا تھا۔ قریب ہی یکن ٹمبل پر آیان بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دن پہلے ہی آسٹریلیا سے اپنے سمسٹرز سے فارغ ہو کر آیا تھا۔ وہ مہران سے چھوٹا تھا۔ سب سے بڑی سارہ تھی۔ آیان اکاؤنٹس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ مہران ڈاکومنٹریز بنا تا تھا۔ تین سال پہلے وہ بھی آسٹریلیا میں ہی تھا۔“

”حیرت ہے! جنت اب تمہارے کسی کام کی نہیں رہی۔“ آیان نے مزایا۔

”وہ گلاس اپنے لیے بھر کر اور ایک جنت کے لیے وہیں چھوڑ کر وہ یکن کے دروازے سے پیچھے لان میں آگیا۔“

”تو وہ محترمہ یہاں گری تھیں۔“ آیان نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

مہران نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگا۔ ”اکبر نے پانی کے پائپ کے لئے کھدائی کی تھی۔ موسم بدلا تو اس نے کام درمیان میں ہی روک دیا۔ پانی کا مسئلہ حل ہو گیا تو یہ گڑھا ایسے ہی رہ گیا۔“

”اگر اکبر کام مکمل کر لیتا تو وہ یہاں نہ گرتی۔“

”مگر یہ نہ ہوتا تو بھی وہ کیس نہ کیس جگہ تلاش کر کے گری جاتی۔“

”ہاں۔ اتنا شوق تھا گرنے کا۔“ کے نو“ لے جاتے۔

ایک ہی بار شوق پورا کر دیتے۔“ آیان کہہ کر ”نھی کھی“ کرنے لگا۔

”تمت پوچھو کیسے گرتی تھی۔ یونو! جو بلیک لائک شوز اس نے پہن رکھے تھے۔ وہی شوز جو پاؤں پر پھپھن کر داک کرتی ہیں اور ٹک ٹک کرتی مزے سے چلتی جاتی ہیں۔ بس اسے یہ غلط تھی بھی کہ وہ بھی انہیں پہن کر برف پر ویسے ہی چل سکتی ہے۔“

آیان کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

”جب میں یہاں اسے اپنی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی بری طرح گرے گی مگر

جب وہ گری تو نہیں ہنس کر میرا برا حال ہو گیا۔ جسے اس کے سر پر جا کر گھڑا ہوا تو اس کی شکل دیکھنے والا تھی۔“

”بہت خوب صورت تھی وہ۔“

”نہیں۔ خوب صورت تو نہیں۔ مگر کوٹ تھی۔ غصہ کرتی تو چھوٹی سی مانوٹی لگتی تھی۔“

”اس مانوٹی سے تھوڑی سی دوستی ہی کر لیتے۔“

”کیسے کر لیتا، ایک کے بعد ایک واقعہ ہوتا چلا گیا۔ وہ چلی گئی۔ میں کام سے صبح اسلام آباد چلا گیا تھا۔ وہ آیا تو وہ جا چکی تھی۔ سوئے جنت بازار میں ملنے والا سے بھی اچھی دعا سلام رکھتی ہے۔ شر اور گھر کا نہ رکھتی ہے ایک فون نمبر نہیں لے سکی اس سے۔“

”افسوس جنت کی کارکردگی پر۔“ آیان مزے رہا تھا۔

”کہہ رہی تھی اتنا کام تھا ان دونوں کہ ہوش ہی رہا بس اتنا معلوم ہے کہ وہ لاہور سے آئی تھی۔“

”اسے معلوم ہے تاکہ تم یہاں رہتے ہو۔“

”ہاں۔ ڈیڑھ سال ہو گیا۔ اسے تو معلوم ہے ہمارے گھر کا۔“ مہران نے آہ بھری ”پھر بھی۔“

”پھر بھی یہ کہ وہ تم جیسے بد تمیز سے ملنے کیوں آئے۔ ویسے مہران اسے پسند کرتے ہو یا محبت؟“

”محبت کا تو نہیں معلوم۔ لیکن جس دن سے وہ ہے اسی دن سے وہ مجھے یاد آنے لگی ہے۔ کوئی وجہ نہیں اور پھر بھی۔ فیس بک پر ڈھونڈا۔ خراخان احمد خرا سلطان خرا زبان اور نہ جانے کتنی خرا کو مہر کر چکا ہوں۔ مگر وہ خرا نہیں ملی۔“

”وہ تمہیں پسند کرتی ہوگی بہت ہو سکتا ہے دوبارہ آئی ہو یہاں ٹھونسنے مگر یہاں نہ آئی ہو۔ ظاہر ہے اگر وہ یہاں نہیں آئی تو اس کا مطلب بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ ہو سکتی ہے ہو سکتا ہے اس کی شاہد ہو چکی ہو یا وہ کسی کو پسند کرتی ہو اور یہ بھی کہ اسے بھی نہ ہو کہ وہ بھی یہاں آئی بھی تھی اور یہ کہ ہو کوں۔“ تم نے ان امکانات پر غور کیا؟“

”نہیں۔“ مہران نے جل کر کہا۔ ”میں نے

صرف ایک امکان بر غور کیا ہے کہ وہ یہاں آئی ہے اور کہتی ہے۔ میں تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئی ہوں۔
 ”فرض کرو ایسے ہو جاتا ہے تو۔“
 ”تو بس آگے اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“
 ”چلو اب یہ فرض کرو کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“
 ”مہراں نے اس بار صرف اسے گھور کر ہی دیکھا۔
 ”وہ نہیں پسند نہیں کرتی۔“
 ”تم اس سے پوچھ کر آئے ہو؟“
 ”واقعات اور مان گواہ ہے لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں جو ان سے تیز سے بات کریں۔ انہیں نہیں جو انہیں کھری کھری سنائے ویسے انکل شیراز کی بیٹی کا کیا کرنا ہے۔ بہت خوب صورت ہے صوفیہ۔“
 ”یار! سارہ! پاپا سب نے ٹھک کر رکھا ہے“
 چاہتے ہیں راتوں رات دو لہا بن کر اس کے گھر پہنچ جاؤں۔“
 ”میری مانو تو صوفیہ کے لیے ہاں کہہ دو۔ حرا نہیں آئے گی۔ سوڑھ سال کم نہیں ہوتا۔“
 ”کہہ تو ٹھیک رہے ہو بلکہ۔ اداسی ختم ہی نہیں ہوتی یہ سوچ کر کہ وہ چلی گئی اور اب انہیں رہی۔“
 ”چلتے ہیں پھر آج ہی انکل شیراز کے گھر۔“ آیان نے اسے بہلایا۔ ”کچھ دن لگیں گے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے وہ میگزین مجھے بھی دکھائیں۔ کہاں ہیں۔“
 نہ چاہتے ہوئے بھی مہراں مسکرانے لگا۔
 ”ویسے اچھا ہونا کہ تم لاہور جا کر گلی گلی اسے تلاش کرتے۔“
 ”لاہور بہت بڑا ہے۔“ مہراں نے کہا۔ ”وہاں گلیاں بھی بہت ہوں گی۔“
 ”ہو سکتا ہے وہ کسی اور شہر شفٹ ہو چکی ہو۔“
 ”تم کتنی بکواس کرتے ہو۔“
 ”ہو سکتا ہے وہ ملک سے ہی باہر چلی گئی ہو۔“ آیان خاموش نہیں ہو رہا تھا۔
 ”ہو سکتا ہے“ وہ یہاں آنے کی تیاری کر رہی ہو۔
 ”مہراں نے منہ لٹکا کر کہا۔

”یہ آخر والا ہو سکتا“ ہوتا نظر نہیں آ رہا۔
 چھوڑو مہراں اب۔ بس۔“
 ☆ ☆ ☆
 عمل اور معاذ کی بات کی کڑی گئی تھی۔ حرا فون کر کے کئی بار معاذ کو مری جانے کے لیے کہا مگر ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ڈر گیا تھا خاص کر کسی لڑکی ساتھ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس بار وہ لاہور آیا تو وہ اس کے سر ہو گئی۔ صرف معاذ ہی تھا جو اسے جاسکتا تھا۔ پاپا تو خیر کبھی نہ جاتے اور نہ ہی جزار ساتھ جانے دیتے اور نہ کوئی سمجھتا تھا کہ اس کی خاص ضرورت ہے۔
 ”نہ اب نہیں بھی حرا میں بہت ڈر گیا ہوں۔“
 ”آپ کو تو بہت پسند ہے وہ علاقہ۔“ وہ کب سے اسے منار ہی تھی۔
 ”بے حد پسند ہے لیکن کسی لڑکی کو لے کر نہیں جاؤں گا۔“
 ”نمل کے ساتھ بھی نہیں؟“
 ”نہیں۔ میں بہت محتاط ہو گیا ہوں۔“
 ”حادثات تو ہوتے ہی ہیں۔ ہم سب ٹھیک ٹھاک واپس تو آ گئے نہ۔“
 ”ایک بار ٹھیک ٹھاک واپس آ گئے۔ نہ جانے آ کر کیا ہو۔“
 ”آپ اتنا ڈر گئے ہیں اب سردیاں بھی نہیں ہیں۔ سب جاتے ہیں وہاں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔ ”میں اتنے سارے میسے جمع کر لیے ہیں۔ آپ کے میسے ختم نہیں ہوں گے۔“
 ”مسئلہ میسے نہیں ہیں۔“
 ”پلیز میرے لیے۔ خدا کے لیے کوئی تو چلے وہ میرے ساتھ۔“ وہ میچ روٹنے لگی۔ معاذ نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کیا ہوا حرا؟“ وہ بے حد پریشان ہو گیا۔
 ”میں بھول آئی ہوں کچھ وہاں۔ مجھے جا کر لا۔“
 ”دیں۔“

”میں بھول آئی ہو؟“ وہ کیسے سمجھتا۔ حرا نے صرف عملی آنکھوں سے معاذ کو دیکھا۔
 ”میں نے اتنا انتظار کیا کہ کوئی تو مجھے وہاں لے جائے مگر۔“
 معاذ گری سوچ میں ڈوب گیا۔
 ”ڈاکٹر خاور کے گھر جانا ہے؟“
 حرا نے صرف سر ہلایا۔ اندر لاکھ دوسو سے تھے مگر کسی کو تو جانتا ہی تھا۔
 ”ہم ان کے گھر جا کر کہیں گے کیا حرا!“ وہ پریشان ہو گیا۔ ”بہت عجیب سا لگے گا۔“
 ”ہم کہیں گے ہم ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔“ حرا نے جوش سے کہا۔ ”ان سے ملنے آئے ہیں باقی وقت بتا دو گے گا کہ ہمارا جانا ٹھیک تھا یا نہیں۔“
 ناچار معاذ نے پھر سے وہی گینگ اکٹھا کیا کسی کو بھی خبر دیے بغیر۔
 ”ان سب کو ہوٹل میں چھوڑ کر حرا کو لیے وہ چل پڑا۔ گاڑی میں بیٹھی حرا دوسو سو لاکھ کا شکار تھی۔“
 ☆ ☆ ☆
 صرف آیان تھا جو یکسوئی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اما نے اسلام آباد سے سارہ کو بلا لیا تھا۔ پاپا! اما اور سارہ کافی دیر سے اس کی اور صوفیہ کی متوقع گفتگو کو دیکھ کر رہے تھے۔
 مہراں اب ٹاپ کھولے بے مقصد فضول سے آن لائن گیمز کھیلتا رہا تھا۔ اسے وہ رہ کر صوفیہ پر غصہ آ رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی انکل شیراز کی کنواری بیٹی ہونے کی۔ نہ وہ ہوتی نہ اس پر اتنا دیاؤ ڈالا جاتا اس سے شادی پر۔ وہ آرام سے انتظار کرتا رہتا وہ برے برے منہ باریا تھا۔
 ”پاپا! آپ انکل سے کہہ دیں ہم کل آئیں گے ان کے گھر۔“ سارہ نے شاید سب معاملات نبٹا لیے تھے۔

آیان نے اسے آنکھ ماری۔
 ”ٹھیک ہے۔“ پاپا نے فون ہاتھ میں پکڑا۔
 ”میں! اقرقان کا انتظار کر لیتے ہیں۔“ اما نے سارہ کے شوہر کا نام لیا۔
 ”اما! وہ ایک ہفتے تک نہیں آسکتے۔ کیا ضرورت ہے ان کا انتظار کرنے کی۔“
 ”میرا خیال ہے اس کا انتظار کر لینا چاہیے۔“ مہراں نے زور دے کر کہا۔
 ڈاکٹر خاور فون ہاتھ میں لیے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ”پتاؤ پتا سارہ! میں کیا کروں۔“
 ”پاپا! آپ کریں انہیں فون۔“
 ڈور بیل کی آواز صرف آیان نے ہی سنی۔ ناچار ایسے ہی اٹھنا پڑا لیکن جنت پہلے ہی دروازہ کھول چلی تھی۔
 ”ہمیں ڈاکٹر خاور سے ملنا ہے۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی تھی میری بہن کو اپنے گھر میں رکھا تھا جب۔“
 لاؤنج میں بیٹھے مہراں نے لیپ ٹاپ ایک طرف پھینکا اور لیپ کر دروازے تک آیا۔
 آیان انہیں اندر لا رہا تھا۔ مہراں وہیں کھڑا ہو گیا اور معاذ کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرتی حرا۔
 سفید کرنا اور چوڑی دار پا جاے۔ میں وہ پہلے سے زیادہ کیوٹ لگ رہی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے سب ان کی طرف دیکھنے لگے ڈاکٹر خاور حرا کو پہچان کر فوراً اٹھے۔ فون ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھا۔
 جب وہ باری باری سب کو سلام کر رہی تھی تو اس تک آکر رک گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔ پاپا! ہار!!
 وہ دونوں جان گئے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا بن چکے ہیں۔!

